علامہ اقبال کا نظریہ اولیاتِ قرآن

مولانا محمد حنیف ندویؒ

قرآن حکیم کے اولیات کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہ کتب سماوی میں پہلی کتاب ہے جس نے دلوں کے اوراق پر رشد و ہدایت کی داستانیں رقم کیں، جس کی حفاظت و صیانت اور تبیین و وضاحت کا اہتمام ذات واجب نے اپنے ذمے لیا، جس نے زندگی کے تمام رموز و اسرار کا تسلی بخش حل پیش کیا اور جس نے انسانی معاشرے کی عدل و انصاف اور عشق و محبت الٰہی کی بنیاد پر کامیاب تشکیل کی، اور انسانیت کے سامنے فکر و تدبر کی نئی راہیں کھولیں۔ ان مباحث مہمہ سے صرف نظر کر کے ہم اقبال کے اس حکیمانہ تجزیہ کو موضوع تحریر قرار دینا چاہتے ہیں کہ قرآن ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے فکر و نظر اور علم و ادراک کے مصادر اربعہ سے تعرض کیا اور اس کی تفصیلات پر روشنی ڈالی۔ یعنی قرآن ہی نے سب سے پہلے وحی و نبوت پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ قرآن ہی نے تاریخ کی اہمیت پر زور دیا۔ قرآن ہی نے نفسیات کے بارے میں دو ٹوک نظریہ کی طرح ڈالی، اور قرآن ہی وہ صحیفہ عقل و دانش ہے، جس نے مطالعہ فطرت پر انسان کو آمادہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ چار عنوان ایسے ہیں جن سے قرآن کی اولیت نکھر کر فکر و ذہن کی سطح پر ابھرتی ہے:

۱۔ وحی، ۲۔ تاریخ، ۳۔ نفسیات، ۴۔ اور مطالعہ فطرت

یہی علم و دانش کے وہ چار سرچشمے ہیں، جن کو بیک وقت سامنے رکھنے سے زندگی کا صحیح نقشہ مترتب ہوتا ہے۔ جن قوموں نے ان سے استفادہ کیا، وہ زندہ رہیں، اور جنھوں نے ان کو نظر انداز کیا، وہ ذلیل و خوار ہوئیں۔ وحی و نبوت کے سلسلے میں ابتدائی ابواب میں ہم بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ ان کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ البتہ اختصار کی خاطر چند پہلوؤں کی وضاحت بہر حال مفید رہے گی۔ فلسفہ اور نفسیات کے بعض جدید شارحین نے یہ کہہ کر عجیب مغالطہ کی تخلیق کی ہے کہ نبوت و رسالت مریضانہ ذہن کی پیداوار ہے، اور یہ کہ علم و ادراک کا یہ اسلوب جس کا عقل و تجربہ سے کوئی تعلق نہیں مستند نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے ہم پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ دعویٰ کے یہ دونوں حصے محل بحث ہیں، یہ کہ

رشد و ہدایت کا یہ طریق غیر علمی ہے اور یہ کہ نبوت و رسالت کا تعلق غیر سلیم یا غیر متوازن ذہن سے ہے جس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ذہن کسی فکری و عقلی نظام حیات کو جنم دے سکتا ہے۔

ہم ان کے اس دعویٰ کو مغالطہ سے اس لئے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں کہ اس سے خود ان لوگوں کے ذہنی تضاد پر روشنی پڑتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر نبوت غیر متوازن اور غیر سلیم ذہنیت کا نتیجہ ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس نے نہ صرف فکر سلیم کی دعوت دی، بلکہ فکر و تدبر کے دواعی کی پرورش کی۔ اخلاق و روحانیت کے قافلوں کو آگے بڑھایا۔ تہذیب و تمدن کے دبستان سجائے اور اخلاق و معاملات کے بارے میں ایسے اوامر و نواہی کو پیش کیا، جو کمال حکمت و دانش پر مبنی ہیں۔ اسی طرح اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو اس کا کیا سبب ہے کہ اس ذہن نے وحی کے ذریعے زبور، تورات اور قرآن ایسے شاہکار پیش کیے، جن کے جواب سے علم و آگاہی کے دعویدار آج بھی بایں طنطنہ عہدہ برآ ہونے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اور اگر یہ تاریخی حقیقت ہے کہ نبوت و وحی کی ضوفشانیوں سے ہزاروں برس سے ذہن انسانی مستنیر ہو رہا ہے، تو پھر یہ لوگ جو حامل وحی و تنزیل ہیں، خلل دماغ کے مریض کب قرار پاتے ہیں۔ خلل دماغ تو خلل ہی کو پیدا کر سکتا ہے فکری استواری اور کمال کو نہیں۔ اس بارے میں قرآن کا فیصلہ کس درجہ صحیح اور حکیمانہ ہے:

والذی خبث لا یخرج الا نکدا. (اعراف: ۵۸)

اور جو خراب ہے اس سے جو نکلتا ہے وہ بھی خراب ہوتا ہے۔

انبیاء کے بارے میں خلل دماغ کا اعتراض بہت پرانا ہے۔ گزشتہ قوموں نے بھی اپنے دور کے ان پاکیزہ صفات لوگوں کو مجنون اور خبطی ٹھہرایا تھا۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کا گیارہ مقامات پر ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی یہ رائے کسی علمی و ذہنی تجزیہ پر مبنی تھی۔ یہ تو محض الزام تھا، اور اس الزام کے پیچھے دراصل یہ استعجاب کارفرما تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں، جن پر ایک ہی دھن سوار ہے، اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ اس ایک کلمہ کے فروغ کے لئے یہ نہ صبح دیکھتے ہیں نہ شام، ہر وقت اسی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ مزید برآں نہ ان میں مال و دولت کی محبت کا عنصر غالب ہے اور نہ جاہ و حشمت کا خیال۔ یعنی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں، جو ان کو ادائے فرض سے روک سکے۔ ان لوگوں کے لئے یہ بات سمجھنا مشکل تھا کہ کچھ لوگ اغراض و شہوات کی اس سطح سے اتنا بلند بھی ہو سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے وحی و نبوت کی جلوہ آرائیوں کو مریضانہ ذہنیت کی تخلیق قرار دیا وہ دراصل اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نبوت ایک طرح کی طالع آزمائی کا نام ہے، یا چند آسودہ ذہنوں کی جرأت رندانہ

کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ رب ہے، کریم اور منعم ہے، اس لئے اس نے چاہا کہ جہاں اس کی طرف سے انسان کی جسمانی ضرورتوں کی تکمیل کا سامان مہیا کیا گیا ہے، وہاں ان کے فکری، روحانی اور اخلاقی وتہذیبی تقاضوں کی تکمیل واتمام کے اسباب بھی فراہم کیے جائیں:

قال ربنا الذی اعطی کل شیء خلقہ ثم ھدی (طٰہٰ:۵۰)

موسیٰ نے کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو شکل وصورت بخشی، پھر اس کو راہ دکھائی۔

دوسرے لفظوں میں نبوت، نظام ربوبیت کا قدرتی نتیجہ اور مشیت ایزدی کا داخلی تقاضا ہے۔ انسان کی اپنی سعی اور کوشش اور ارادے اور خواہش سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ معمولی انسان، جو خلعت رسالت سے نوازا جاتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا فیضان ہے کہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کیلئے کچھ غیر معمولی نفوس قدسیہ کو چن لیتا ہے۔ یہ انتخاب چونکہ رب علیم وحکیم کا انتخاب ہے، اس لئے اس میں یہ اصول ملحوظ ومرعی رکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو اس منصب کے لئے منتخب کیا جائے وہ اپنی ذہنی و فکری اور علمی وروحانی صلاحیتوں کے اعتبار سے اپنے دور کے تمام لوگوں سے فائق، بلند اور اونچے ہوں:

الله اعلم حیث یجعل رسالته (الانعام:۱۲۴)

اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کا موزوں ترین محل کون سا ہے۔

وحی کا نیچر اور مزاج کیا ہے، قرآن نے نبوت ورسالت کے بارے میں اس امر کی پردہ کشائی بھی فرمائی ہے:

وما ینطق عن الھوی ۔ ان ھو الا وحی یوحی (النجم:۳،۴)

اور وہ خواہش نفس سے منہ سے کوئی بات نہیں نکالتے۔ یہ تو وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔

غرض یہ ہے کہ پیغمبر تجرید اور معروضیت کے اس افق سے بولتا ہے، جہاں اس کی اپنی انا کا وجود نہیں رہتا۔ جہاں ناسوت کا دائرہ لاہوت کے دائرے کے اتنا قریب تر ہو جاتا ہے کہ وحی کی وساطت سے گفتگو آسان ہو جاتی ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے، جس کو الفاظ اور اصطلاحوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ایک طرف تو بشر کے فکری قویٰ وملکات درجہ کمال پر فائز ہوتے ہیں، دوسری طرف تنزیل و ارسال کے دواعی میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، اور اختیار وانتخاب کے تقاضے اپنے دور کے موزوں ترین انسان کے فرق اقدس پر نبوت کا تاج سجا دیتے ہیں۔ تجرید ومعروضیت کا یہ وہ افق ہے، جہاں پیغمبر کی اپنی خواہشات، اپنا ارادہ، اپنے جذبات وعواطف گم ہو جاتے ہیں، اور توجہ ومحبت کا آفتاب نئے اجالوں کو لیے

ہوئے طلوع ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیفیت اور مقام پوری طرح اگرچہ ناقابل فہم ہے، تاہم کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کی جھلکیوں کو کسی حد تک فہم وادراک کے دائرے میں لایا جا سکے۔ جواب یہ ہے کہ یہ ممکن ہے، اس کی حقیقت کو کسی حد تک ہم حدس (Intuiton) اور تصوف کے حوالوں سے فکر ودانش کے قریب تر لا سکتے ہیں۔ حدس اور نبوت میں مماثلت کے دو پہلو نمایاں ہیں۔ اول یہ کہ جس طرح حدس کا ہدف براہ راست معروض ہوتا ہے، اور اس سلسلے میں وہ ہر طرح کے استدلال سے بے نیاز ہوتا ہے، اسی طرح نبوت ووحی کا ہدف بھی براہ راست مصالح عباد ہیں۔ خیر وشر کی تفریق ہے، اور یہ مسئلہ ہے کہ فرد ومعاشرہ کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے کس نوع کے نظام حیات کی ضرورت ہے۔ دوم یہ ہے کہ جس طرح حدس کی صحت واستواری کی شرط یہ ہے کہ اس سے اتصاف پذیر شخص کسی خاص فن میں عالمانہ مہارت رکھتا ہو، اس میں غور وفکر کا عادی ہو، اور اس جزئیات وکلیات سے پوری طرح آشنا ہو، ٹھیک اسی طرح انبیا کے لیے ضروری ہے کہ اخلاق وآداب اور ذہن وفکر کی پاکیزگی اور علو کے اعتبار سے مرتبہ اول پر فائز ہوں، حقیقت کے متلاشی اور حق کے طالب ہوں۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حدس کا معاملہ قلب وذہن کی پختگی اور استواری سے تعلق رکھتا ہے اور نبوت کا تعلق براہ راست فیضان الٰہی سے اور تقاضائے ربوبیت سے ہوتا ہے، یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سینہ جبریل اور لوح محفوظ سے ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حدس قلب و ذہن کی داخلی کیفیت کا نام ہے، اور نبوت اس لطف ایزدی سے تعبیر ہے، جو یکسر سماوی اور فوقانی ہے۔ ان دونوں میں یہ محض مماثلت ہے، جس کو فہم وادراک کے قریب تر لانے کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ ہم اس بات کے قائل نہیں کہ حدس آخر آخر میں اوج ارتقا پر پہنچ کر خود بخود نبوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، کیونکہ نبوت اختیاری نہیں، وہبی ہے۔ یعنی اس کا تعلق سراسر اللہ کی مصلحت انتخاب اور رضا سے ہے۔ کسی شخص کی ذاتی محنت، مجاہدہ اور ذہنی وفکری صلاحیتوں سے نہیں۔

تصوف سے ہماری مراد سالک کی وہ منزل ومقام ہے، جہاں مجاہدہ وریاضت کی وجہ سے اس کو لوح محفوظ یا فلسفہ کی اصطلاح میں عالم گیر ذہن سے ایک گونہ قرب حاصل ہو جاتا ہے اور اس امر کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس پر بعض حقائق کا انکشاف ہو جائے۔ انکشاف یا کشف کی اس نوعیت سے بلاشبہ وحی ورسالت کی صورتحالیوں کو سمجھنے میں ایک حد تک مدد مل سکتی ہے۔ لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وحی اور کشف کے اسلوب اور درجہ استناد میں بہت فرق ہے۔ جہاں وحی اپنے مفہوم

میں واضح، بیّن اور لحاظ سے روشن یا حد درجہ کی استواری لیے ہوئے ہوتی ہے، وہاں کشف میں یہ چیز نہیں ہوتی۔ یہ اکثر مجمل، غیر واضح اور رمزیت سے اتصاف پذیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کے لیے حجت بھی نہیں ہوتا۔ مزید برآں یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر حال میں صحیح اور درست ہی ہو۔ ہو سکتا ہے اس میں سالک کے ماحول، تعلیم و تربیت اور مخصوص خیالات و افکار کا انعکاس پایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل حق نے اس کی جانچ پرکھ کے لیے دو متعین پیمانے مقرر کیے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس میں کوئی شے کتاب و سنت کے منافی نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس کا تعلق دین سے نہیں ہے، کائنات کے اسرار و رموز سے ہے تو اس میں کوئی حقیقت ایسی نہ پائی جائے جو مسلمات عقلی کے خلاف ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مرتبہ اجتہاد کا سا ہے، جس میں صواب و خطا دونوں طرح کے امکانات کا احتمال ہوتا ہے۔

کشف سے صرف اس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ قلب و ذہن کی طرفہ طرازیوں کا دائرہ محدود نہیں، یعنی اس کے حدود و امکان میں یہ وصف داخل ہے کہ بعض حالات میں یہ معروضیت کے کناروں کو چھوئے، اور ایسے حقائق کی یافت پر قدرت حاصل کرے، جن کو باقاعدہ منطقی یا تجربی دلائل اور ذرائع سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو وحی و رسالت کا تصور غیر عقلی نہیں رہتا، کیونکہ دونوں صغریٰ کبریٰ کے ذاتی حاصلات سے مختلف طریق اختیار کرتے ہیں۔ گویا کشف اور وحی میں اتنا ہی فرق ہے کہ جہاں کشف کا تعلق سالک کے ذاتی و شخصی تجربے سے ہے، وہاں وحی کا تعلق تجربے کے ایسے انداز و اسلوب سے ہے جو رضائے الٰہی اور انتخاب ربوبیت سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں کشف و حقائق کے سلسلے میں ایک طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے۔

وحی کے بعد دوسرا سرچشمہ علم و ادراک تاریخ کے صفحات ہیں۔ تاریخ کے معنی یہ ہیں کہ ماضی کے اشخاص، واقعات اور تہذیب و ثقافت کے خد و خال کی اس طرح تشریح کی جائے کہ حال اور مستقبل میں اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

اس کا آغاز اگرچہ دیو مالائی ادب سے ہوا، قصہ و عوامی گیتوں اور کہانیوں کی آغوش میں اس نے جنم لیا، تاہم آج یہ ایک فن اور سائنس ہے۔ محققین نے اس میدان میں اتنی محنت، کاوش اور جستجو سے کام لیا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے دامن میں تقریباً پانچ ہزار سال کا پھیلاؤ سمٹ آیا ہے تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہ ہوگا۔ تاریخ نے ماضی کی کروٹوں کا اس چابکدستی اور تنقید سے جائزہ لیا ہے کہ اس کا چہرہ مہرہ نکھر کر سامنے آ گیا ہے اور ابھی اس کا عمل جاری ہے، اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک انسان

زندہ ہے۔

یہ لفظ بہت سی تاریخی کتابوں کے نام کا جزو ہے جیسے مثلاً تاریخ طبری، تاریخ بغداد، تاریخ مکہ اور تاریخ اندلس وغیرہ۔ مسلمان مصنفین نے اسے وسیع تر معانی میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ایسی کتابوں پر بھی اس کا اطلاق کیا ہے، جن کا تاریخ کے مصطلح مفہوم سے زیادہ تعلق نہیں۔ جیسے البیرونی کی کتاب الہند، کہ اس میں صرف ہندوستان کے مروجہ علوم و معارف سے تعرض کیا گیا ہے۔

تاریخ پر مختلف لوگوں نے اپنے اپنے زاویۂ فکر سے نظر دوڑائی۔ اہل کتاب نے بائبل کو ماخذ ٹھہرایا، اور اس سے کائنات کے اسرار و رموز دریافت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کوشش اس لیے ناکام قرار پائی کہ ایک تو اس میں صرف اسرائیلی روایات کی روشنی میں دنیا کو دکھایا گیا ہے۔ دوسرے جن پیمانوں سے کام لیا گیا اور کائنات کے بارے میں جو رائے قائم کی گئی، بقول والٹر کے اس میں تخلیق و آفرینش کے سائنسی تصور کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ البیرونی نے اس کے مندرجات کو تقدم کے اعتبار سے غلط بتایا، اور اوقات و ازمان کی جو غلطیاں اس میں رہ گئی ہیں ان کی باقاعدہ نشان دہی کی، اور بتایا کہ اس میں واقعات و اشخاص کے بارے میں غلط اندازوں سے کام لیا گیا ہے۔

ہیگل نے تاریخ کے انقلابات کو تصوراتی نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور یہ کہا کہ اس کا تعلق فکری و روحی اضداد کی ترتیب پذیری سے ہے۔ اس سلسلے میں اپنے مذہب و دین کی اہمیت پر بھی زور دیا، اور اس حقیقت کی پردہ کشائی بھی کی کہ مختلف زمانوں اور حلقوں میں کن کن مذاہب نے کیا خصوصی کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں اس کا تجزیہ کچھ یوں ہے کہ جہاں تک یہودیت کا تعلق ہے اس نے انسانی فرائض کی تشریح کی۔ کنفیوشس نے نظم و نسق کی اہمیتوں پر زور دیا۔ بدھ ازم نے صبر، برداشت اور تحمل کی حمایت کی۔ عیسائیت نے محبت اور پیار کی دعوت دی اور اسلام نے عدل و انصاف کے داعیوں کی پرورش کی۔ کارل مارکس نے ہیگل کے تصورِ اضداد کو الٹ دیا، اور تاریخ کو مادی اضداد کے روپ میں پیش کیا، اور یہ کہا کہ اس کی تخلیق و تعمیر میں صرف اقتصادی عوامل کا عمل دخل ہے۔

ہابس اور سپائنوزا نے تاریخ کو قوانین فطرت کا رہین منت قرار دیا۔

دیکارت نے کہا کہ تاریخ مذہب و حقانیت کے محور کے گرد گھومتی ہے۔

تاریخ کے بارے میں یہ مختلف نظریات ہیں، جن کے حق و ناحق ہونے پر بحث و تمحیص کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ان سب میں یہ ہمہ گیر نقص ہے کہ کسی کے سامنے بھی تصویر کا پورا رخ نہیں۔ سب

نے بعض اجزا، اقوام اور زمان کو دیکھا ہے اور ایک سرسری سا کلیہ وضع کر لیا ہے۔ یہ سب آراء یک طرفہ، ناقص، اور نامکمل ہیں۔ انسانی تاریخ ابھی ختم نہیں ہوئی، اس کا عمل تسلسل کے ساتھ برابر جاری ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ چل کر یہ کیا رنگ اختیار کرے گی، اور انسانی تہذیب و ثقافت اپنے ارتقا کے مراحل میں کن مفید، انفع اور صحیح معیاروں اور پیمانوں کی حامل ہوگی۔

قرآن حکیم نے تاریخ کو ایک نئے زاویہ نظر سے پیش کیا۔ یہ کتاب حکیم تاریخ میں جبریت واضطرار کی قائل نہیں۔ اس کے نزدیک انسانی شعور وادراک، انسانی تجربہ، اور انسان کی فطری نیکی کو تاریخ کے دھاروں کو موڑنے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ کے بارے میں قرآن کا خاص نظریہ یہ ہے کہ گزشتہ اقوام و ملل اور گزشتہ تہذیبوں پر اس نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے کہ ان میں شر، برائی اور فساد و تخریب کے وہ کون عناصر ہیں جن کی وجہ سے یہ صفحہ ہستی سے مٹیں اور وہ کون سے پیمانے، اصول اور معیارات ہیں، جن کو زندہ اور قائم رہنا چاہیے، جن کو آگے بڑھنا چاہیے اور جن کی اساس پر معاشرے کی تعمیر نو کا فریضہ انجام دینا چاہیے:

افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم (یوسف: ۱۰۹)

کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر و سیاحت نہیں کی (اور یہ نہیں دیکھا) کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیا ہوا۔

امت مسلمہ کے فرائض میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ حالات اور زمانے کی کروٹوں نے اس کے لیے تہذیب و تمدن کا جو دائرہ مقرر کر دیا ہے، اس کے اندر یہ اپنے کو محصور اور مجبور تصور کرے، یا سائنس اور ٹیکنالوجی نے زندگی کے جس نہج اور پیمانوں کو اپنا لیا ہے ان کی اندھا دھند پیروی کرتی رہے۔ بلکہ اس کے فرائض کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے ہر دائرے اور تہذیب و تمدن کے ہر ہر نقشہ کو کتاب و سنت کے سانچوں میں ڈھالنے کی سعی کرے، خیر اور نیکی کو اپنائے، شعور وارادہ کی نعمتوں سے بہرہ مند رہے اور ان تمام عناصر اور قوتوں سے برسرِ پیکار رہے، جن سے برائی پھیلتی ہے، جن سے قلب و روح کی پاکیزگی مجروح ہوتی ہے، جن سے تعلق باللہ میں خلل پیدا ہوتا ہے، اور انسان کھری مادیت کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں انسان کو چاہیے کہ وہ ان تمام غلطیوں سے دامن کشاں رہے، جن کی بدولت پہلی قومیں تباہ ہوئیں:

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف و ینھون عن

المنکر و اولئک ھم المفلحون۔ (آل عمران: ۱۰۴)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے، معروف اور نیکی کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔ یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔

تاریخ کے بارے میں اس زاویہ نظر کو مان لیجیے، تو پھر یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کہ مذہب و دین اقتصادی اور تہذیبی عوامل کا پروردہ ہے اور مجبور ہے کہ ان اسباب و محرکات نے زندگی کا جو اور جس ڈھب سے نقشہ ترتیب دیا ہے، اسی کا تتبع کرے۔ اس زاویہ نظر کو مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے انسانی حریت و شرف کو تسلیم کر لیا۔ آپ انسانی ارادے کی عظمت کے قائل ہو گئے اور شر و فساد کے مقابلے میں خیر و جمال اور معروف و پاکیزگی کی قوتوں کی برتری کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ یعنی تاریخ انسانی پر آپ نے عبرت پذیری اور حقیقت پسندانہ نقطہ نگاہ سے غور کیا۔ موجودہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے مختلف میدانوں میں خیر و شر کے درمیان فکری و عملی لڑائی جاری ہے۔ اور انسان بے وقوف نہیں ہے اور تاریخ سے اخذ نتائج پر قادر بھی نہیں کہ خود اللہ تعالیٰ اس معرکے میں حق کے ساتھ ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ بالآخر دلوں میں رجوع الی اللہ کا جذبہ غالب آئے گا، سچائی نکھرے گی، نیکی اور پاکیزگی کا بول بالا ہوگا اور انسان مادیت کی گھٹن سے نکل کر ایک مرتبہ پھر اخلاق و روحانیت کے جاں آفریں دبستان میں سانس لینے پر مجبور ہوگا:

کذلک یضرب اللہ الحق والباطل فاما الزبد فیذھب جفآء ج واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (الرعد: ۱۷)

اس طرح اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ سو جھاگ (یعنی باطل) تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور پانی جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔

انسان کے مصادر علم میں جس نئے مصدر و سرچشمہ کا اس دور میں اضافہ ہوا ہے، وہ نفسیات ہے۔ اور قرآن حکیم نے سب سے پہلے علم و حکمت کے اس منبع کی طرف نہ صرف توجہ دلائی بلکہ یہ پیش گوئی بھی کی کہ ایک وقت آئے گا جب اس علم کے ذریعے ایسے چشم کشا حقائق سامنے آئیں گے کہ جن سے دہریت والحاد کے دل بادل چھٹ جائیں گے، اور حقانیت نکھر کر قلب و ذہن کو مسحور کر دے گی۔ قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں پیش گوئی کی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی تدابیر تکوینی ہے، خود سائنس، طبیعیات، اور علوم ارضی مادیت کے ابطال اور اثبات توحید پر اس کے شواہد و دلائل فراہم ہو سکیں، ٹھیک اسی طرح علم نفسیات

آخر آخر میں ایسے سانچوں میں ڈھل جائے گا کہ جن کی وجہ سے تعمیر اخلاق و کردار کا کام لیا جا سکے گا۔ سورہ ذاریات میں ہے:

وفی الارض ایت للموقنین۔ وفی انفسکم افلا تبصرون۔ (الذریات:۲۰،۲۱)

اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور خود تمہارے نفوس میں نشانیاں ہیں، تو کیا تم دیکھتے نہیں؟

نفسیات کے معنی اس حقیقت کو دریافت کرنے کے ہیں کہ انسان کے لاشعور پر خارجی اور داخلی عوامل کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ لاشعور کیونکر انسان کو اخلاق و کردار کیلئے ایک خاص مزاج اور سانچہ مہیا کرتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ ہنوز یہ علم پوری طرح سائنس نہیں بنا۔ تاہم یہ بات مسلمہ ہے کہ لاشعور اور شعور میں گہرا ربط ہے، اور دونوں ایک دوسرے کیلئے ایک طرح سے لازم و ملزوم ہیں۔ یہی نہیں، یہ دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی رہتے ہیں اور دونوں مل جل کر ایک شخص کی زندگی کا رخ متعین کرنے میں ممد و معاون بھی ثابت ہوتے ہیں، اور پھر جہاں دونوں کی باہمی جنگ سے متعدد نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں وہاں ان کے توافق و ہم آہنگی سے یہ الجھنیں حل بھی ہوتی ہیں۔

کیا انسان اپنی جسمی اور عضویاتی ساخت و جذبات و احساسات کی رو سے دراصل مجرم اور گناہ گار ہے؟ فرائڈ نے اپنے نظریہ کی اساس اسی مذہبی اذعان پر رکھی اور خود ساختہ دلائل و شواہد کی مدد سے لاشعور کی اس طور سے جانچ کی کہ اس سے جنس کی نعش برآمد کی جا سکے۔ لیکن انسان کے جذبۂ شرافت نے اس تحلیل کو قبول نہیں کیا۔ چنانچہ خود اس کے ماننے والوں نے، ایڈلر اور یونگ نے اس کی مخالفت کی، اور اس نقطۂ نظر کو ناقص ٹھہرایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محققین نفسیات کی یہ رائے قرار پائی کہ انسانی کردار و سیرت کا محرکِ اول، انسانی فطرت میں پنہاں یہ جذبہ ہے کہ اسے زندہ رہنا اور مسرتوں کے حصول میں سبقت لے جانا ہے۔ یعنی دراصل جو چیز انسان کے کردار و عمل کا تانا بانا تیار کرتی ہے وہ بقائے حیات اور تحسین حیات کا جذبہ ہے، جنسی تاثرات نہیں۔ قرآن نے اس سلسلے میں تین چیزوں کی خصوصیت سے نشاندہی کی۔

۱۔ یہ کہ لاشعور سے کہیں زیادہ شعور کی اہمیت ہے:

ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولاً۔ (بنی اسرائیل:۳۶)

کان، آنکھ اور دل، ان تمام جوارح سے بعض پرس ہوگی۔

جس کے معنی یہ ہیں کہ صرف احساسات و مشاہدات اور ان کی اثر اندازیوں کا اعتبار نہیں، جوارح اور ان کے افعال و وظائف سے صحیح کام لینا ضروری ہے، اور ان کے لیے ایسے سانچے مہیا کرنا اہم ہے، جو تعمیر سیرت و کردار میں مفید ہوں۔

۲۔ انسان اگرچہ اس عالم مادی میں رہتا اور زندگی بسر کرتا ہے، تاہم اس کی حیثیت صرف یہی نہیں کہ عالم مادی اور اس میں تفاعل اور تاثر کا عمل جاری رہے بلکہ اس کا امتیازی وصف اس کا ارادہ، اختیار اور وہ امتیازی صلاحیت ہے، جس کی بدولت یہ خیر و شر کے پیمانوں میں تفریق کرتا اور حالات سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے اسے کائنات رنگ و بو پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

انا عرضنا الامنة علی السموت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان۔ (الاحزاب:۷۲)

ہم نے بارِ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، تو انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نقطۂ نظر سے آئندہ نفسیات کے ماہرین کی توجہ کا مرکز صرف یہی نہیں رہنا چاہیے کہ لاشعور کن کن الجھنوں کو جنم دیتا ہے، کن کن امراض کو ابھارتا ہے یا سیرت و کردار کی تشکیل میں کس حد تک مخل ثابت ہوتا ہے، بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ انسان کا امتیازی وصف جسے قرآن ارادہ و اختیار سے تعبیر کرتا ہے، کس درجہ قوی، فعال اور نتیجہ آفرین ہے۔ یعنی انسان اپنے ارادہ و عزم کی بدولت کس طرح نفسیاتی اضداد سے پیچھا چھڑا سکتا ہے، کیونکر بیماریوں اور الجھنوں سے خلاصی حاصل کر سکتا ہے، اور کس طریق سے توازن و اعتدال کی زندگی بسر کرنے پر قدرت حاصل کر سکتا ہے۔

۳۔ تیسرا اہم اور بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اگر آپ فرد کی بے اطمینانی کو فی الحقیقت دور کرنا چاہتے ہیں، اور دل سے چاہتے ہیں کہ وہ صرف ذہنی الجھنوں سے نجات پالے، بلکہ نفسیاتی اعتبار سے اس لائق ہو کہ دنیا میں اپنا تخلیقی کردار ادا کر سکے، تو اس کے رشتۂ ذہنی کو انسانی انا کے سمٹے ہوئے حدود سے نکال کر، ایک وسیع تر انا کے دائرہ رحمت و شفقت میں داخل ہونے کے مواقع فراہم کیجئے، اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہوگا، جب خدا سے بھاگا ہوا انسان پھر ایک مرتبہ اس کی دہلیز جلال پر سجدہ کناں ہو:

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد:۲۸)

اور سن رکھو کہ خدا کی یاد ہی سے دل آرام پاتے ہیں۔

جس طرح قرآن حکیم نے وحی وتنزیل کے اسرار کی وضاحت کی ہے، تاریخ کے بارے میں تاریخی استقرا کو پیش کرکے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کے مطالعے سے قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کا کھوج لگایا جائے، اور جس طرح نفسیات میں شعور کو فعال اور تخلیقی عنصر ٹھہرا کر قرآن نے نفسیات کے ارتقا کے لیے صحیح خطوط کا تعین کیا ہے، اسی طرح یہ وہ پہلی کتاب ہے جس نے عقائد، عبادات اور اخلاقی تعلیمات کے پہلو بہ پہلو، مطالعہ فطرت پر زور دیا ہے، اور بتایا ہے کہ اس کارخانہ قدرت میں جو ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، سوچ بچار، فکر وتدبر، اور عقل ودانش کے لیے خاصا سامان عبرت فراہم کردیا گیا ہے۔

ان فی خلق السموت والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایت لقوم یعقلون۔ (البقرہ: ۱۶۴)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں، اور کشتیوں اور جہازوں میں، جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں دواں ہیں، اور مینہ میں، جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اس سے مراد زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے، اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں، عقل مندوں کے لیے خدا کی نشانیاں ہیں:

ان فی خلق السموت والارض واختلاف الیل والنہار لایت لاولی الالباب۔ (آل عمران: ۱۹۰)

بے شک زمین اور آسمان کی تخلیق اور رات دن کے بدل بدل کر آتے جانے میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

قرآن کے نقطہ نظر سے سائنس اور دین میں کوئی تناقض، ان بن یا اختلاف رونما نہیں، کیونکہ جس خدا نے اس عالم آب وگل کو پیدا کیا، اور کائنات کو سجایا اور سنوارا، اسی کے تقاضائے کرم ورحمت نے دین کی طرف رہنمائی فرمائی، اور انسانی زندگی کے لیے حسین وجمیل نقشوں کو ترتیب دیا، تکوینیات اور شر

علامہ اقبال کا نظریہ اولیات قرآن
مولانا محمد حنیف ندوی

حیات کی آخری اور ابتدائی منزل ایک ہی ہے۔ دونوں کا مقصد انسان کی فلاح، خیر اور بہبود ہے۔ جس اختلاف کو پچھلی دو صدیوں میں اچھالا گیا، اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، اس میں تین نکات قابل لحاظ ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ کلیسا کے مزعومات واذعانات کا نام دین نہیں، اور نہ اس کتاب کا نام دین ہے، جس کی ترتیب وتدوین تاریخ کے مختلف مرحلوں میں ہوئی، اور غیر الہامی تصورات وخیالات نے اس میں راہ پائی۔

۲۔ ماضی میں مذہب ودین کی تاویل وتعبیر میں اس نکتہ کو بھی فراموش کردیا گیا کہ خدا کا عطا کردہ دین جس طرح عمل وسیرت کی تصحیح وتزئین کا ذمہ دار ہے، اسی طرح اس کے دائرے کار میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ خدا اور کائنات کے بارے میں وہ موقف اختیار کرے جو سچائی اور حقیقت پر مبنی ہو، اور حقائق اشیاء سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔

۳۔ پچھلی دو صدیوں میں سائنس کے نام پر جو ملحدانہ نتائج اخذ کیے گئے، وہ ہرگز سائنس نہیں تھے۔ سائنس اور ہے، اور اس سے اخذ کردہ نتائج اور۔ دونوں میں اختلاف وتضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سائنس یہ بتاتی ہے کہ یہ کارخانہ قدرت کن اسباب وعلل کے بل پر قائم ہے اور انسانی فلاح وبہبود کی خاطر ہم اس سلسلہ تعلیل وتسبب سے کس حد تک استفادہ کرسکتے ہیں۔ اور دین یہ بتاتا ہے کہ اخلاق کو سنوارنے، عادات وسیرت کو حسن وجمال کے سانچوں میں ڈھالنے اور اللہ تعالیٰ سے رشتہ وتعلق پیدا کرنے کے لیے کونسا نظام حیات ایسا ہے جس کو اپنانا چاہیے۔

دین وعلوم یا انسانی تجربات واکتشافات اور دین کے اخلاقی وروحانی تجربات میں پوری پوری ہم آہنگی کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معجزات وخوارق کے باب میں البتہ دونوں میں بظاہر تصادم نظر آتا ہے، اور اسی مفروضہ تصادم کو ملاحدہ نے بڑھا چڑھا کر بیان بھی کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ دور میں اس شبہے کے جواز میں کیا کہا جائے گا، جب کہ خود ذرتی تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ یہاں تعلیل وتسبب کی دو شکلوں میں ایک شکل وہ ہے، جو عموماً اس کارخانہ قدرت میں کارفرما اور جاری وساری ہے اور تمام ایجادات واکتشافات کی جان اور اساس ہے۔ اور ایک وہ شکل ہے جو مخفی، غیر معلوم اور ہنوز غیر متعین سلسلہ تعلیل سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی وہ جس کے بل پر ذرہ کی کہربائی لہریں ایک مالکیول (سالمہ) تیار کرتی ہیں، اور پھر اس مالکیول سے ایک جسم ترکیب پذیر ہوتا ہے۔ اور اگر یہ تجزیہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تمام اشیاء کی تخلیق وآفرینش اپنے پہلے مرحلے میں بہرحال ایک

طرح کے خرق عادت کی رہین منت ہے۔ کیونکہ معجزہ یا خرق عادت کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ بعض تصرفات اپنے ظہور میں عام قانون تعلیل کے محتاج نہیں ہوتے، بلکہ ان کا تعلق براہ راست اس سلسلہ تعلیل سے ہوتا ہے، جس کا براہ راست تعلق اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے ہے۔

ذرہ تو بہر حال تخلیق و آفرینش کی سب سے نچلی سطح ہے۔ سب سے اوپر کی سطح خود انسان کی نفسیات ہے۔ جس طرح عام عالم مادی اور ذرہ کے عمل میں تعلیل و تسبب کی دوئی یا ثنویت کارفرما ہے، ٹھیک اسی طرح ذہن انسانی میں بھی یہی دوئی اور ثنویت پائی جاتی ہے۔ یعنی نفسیات کے ماہرین اب تک یہ نہیں جان پائے کہ لاشعور کے محرکات کے باوجود انسان میں اپج، اختراع اور ارادہ کی خود مختاری کیونکر ابھرتی ہے، اور اس میں اسباب وعلل کا وہ کون سلسلہ ہے جو اس کی تخلیقی قوتوں کو ابھارتا، رنگ و روغن عطا کرتا اور اختیار کے دائروں میں وسعت بخشتا ہے۔ یا جواسے جبر و اضطرار کی عامیانہ سطح سے اونچا اٹھا کر انسانیت کے فراز اعلیٰ تک اچھال دینے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ تعلیل کے بارے میں جس اذعان اور مفروضہ نے انسان کا گمراہ کیا تھا، اسی کی ثنویت اور دوئی نے اس کو ایمان و ایقان کی سرحدوں کے قریب لاکھڑا کیا ہے۔

دراصل یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہدایت برابر کارفرما اور فعال ہے۔ یعنی تکوینی وعلمی سطح پر وہ ایسے ایسے شواہد و دلائل کو فکر و نظر کے سامنے لارہی ہے جن سے انسان اس قابل ہو جائے کہ ایمانیات و عقلیات کو باہم سمو کر زندگی کا نقشہ ترتیب دے۔ ہمارے نزدیک وہ وقت دور نہیں ہے جب انسان عقائد میں ابن رشد کی اس رائے میں ہم نوائی اختیار کرنے سے انکار کردے گا کہ یہاں دو سچائیاں ہیں، ایک دینی اور دوسری عقلی و فکری۔ اور اس کے بجائے اس کا نعرہ یہ ہوگا کہ میں جن چیزوں پر ایمان رکھتا ہوں، ان کو عقلی و فکری حیثیت سے صحیح بھی مانتا ہوں۔

علوم و معارف اور کائنات کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر کس درجہ تحقیقی، تخلیقی اور صحت و استواری لیے ہوئے ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس نے خصوصیت سے اس عالم رنگ و بو کی معروضیت کو تسلیم کیا۔ اس کے وجود خارجی کو مانا، اور اس کی تخلیق و آفرینش کی غرض و غایت کو اجاگر کیا۔ یعنی اس نے اس کے برعکس نہ تو افلاطون کی طرح اس دنیا کو حقیقی دنیا کا محض ظل اور پرتو کہا، اور نہ ہندو فلسفے کی زبان میں اس کو ”مایا“ ہی گردانا۔ بلکہ کیا تو یہ کیا کہ کائنات کا وجود، اثبات و تحقق کے ان تمام لوازم اور اغراض کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جن کے بل پر کوئی شے حقیقت کا پیرا ہن اختیار کرتی ہے اور

تصوریت کے خیالی حصار سے نکل کر اثبات و تحقق کے وجود اور ٹھوس دائرے میں داخل ہوتی ہے:

وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا (ص: ۲۷)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کائنات ان میں ہے اس کو خالی از مصلحت پیدا نہیں کیا۔

وما خلقنا السموت والارض وما بینھما الا بالحق (الحجر: ۸۵)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو مخلوقات اس میں ہے اس کو حق کی غرض سے پیدا کیا ہے۔

قرآن اس کائنات کی معروضیت ہی کا علم بردار نہیں، اس حقیقت کا اولین اعلان کرنے والا بھی ہے کہ یہ ساری کائنات جس میں افلاک اور نجوم و کواکب اور ان کے وسیع تر حلقے داخل ہیں، مسخر ہیں اور انسان کے فائدے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ گویا انسان کی فکری و عملی تگ و تاز کے دائرے زمین سے لے کر آسمانوں تک پھیلے ہوئے ہیں:

وسخر لکم الشمس والقمر دائبین (ابراہیم: ۳۳)

اور سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کردیا اور اب یہ ایک دستور پر چل رہے ہیں۔

وسخر لکم الیل والنھار والشمس والقمر (النحل: ۱۲)

اور اسی نے تمہارے لیے رات دن، اور سورج اور چاند کو زیر فرمان کردیا۔

اور اس کے معنی یہ ہیں کہ مرد مسلم کے فکر و تدبر اور حوصلہ و ظرف کی وسعتیں صرف اس بات کی مقتضی نہیں ہیں کہ وہ دنیا جیسی بھی ہے اس کے ساتھ ہم آہنگی اور مصالحت کا انداز اختیار کرے۔ بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر اس بات کی طالب ہیں کہ یہ کائنات کو اچھی طرح سمجھے، اس کے اضداد کو دریافت کرے، ان پر قابو پائے، ان میں تصرف کرے اور ان کو بدلے، اور اس طور سے کائنات کی تسخیر کرے کہ اس میں انسان کے فائدے اور مصلحت میں کوئی منافات باقی نہ رہے۔ یہی نہیں، ان کوششوں کو یہ اس وقت تک جاری رکھے، جب تک کہ یہ عالم مادی صحیح معنوں میں اس کے لیے برکت و رحمت کا گہوارہ نہ بن جائے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مرد مسلم کی اس دنیا کے بارے میں یہی آرزو اور تمنا بھی ہے، اور یہی خواہش اور دعا بھی!

ومنھم من یقول ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ (البقرۃ: ۲۰۱)

اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما، اور

آخرت میں بھی نعمت سے بہرہ مند کر، نیز ہمیں دوزخ سے بھی محفوظ رکھ۔

کائنات کے متعلق قرآن کے اولیات میں یہ بھی سرفہرست ہے اور لائق صد ستائش ہے کہ اس نے جس منہاج فکری کی نشاندہی کی، وہ استقرائی ہے، حالانکہ اس دور میں لوگ اس کی اہمیت سے قطعی آشنا نہ تھے۔ سورہ بقرہ میں ہے:

ان فی خلق السموت والارض واختلاف الیل والنهار والفلک التی تجری فی البحر بماینفع الناس وما انزل الله من السماء من ماء فاحیا به الارض بعد موتها وبث فیها من کل دابة وتصریف الریح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایت لقوم یعقلون ۔ (البقرہ:۱۶۴)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں، اور کشتیوں اور جہازوں میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں اور مینہ میں، جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندگی عطا کرتا ہے، اور زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں، عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

سورہ یونس میں ہے:

قل انظروا ماذا فی السموت والارض (یونس:۱۰۱)

ان سے کہہ دیجیے کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے۔

سورہ آل عمران میں مومنین کے کوائف واحوال کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

الذین یذکرون الله قیما وقعودا وعلی جنوبهم ویتفکرون فی خلق السموت والارض (آل عمران:۱۹۱)

جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے، ہر حالت میں خدا کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہیں۔

یہی وہ منہاج فکری تھا، جس کو اساس قرار دے کر کندی، جابر بن حیان، ابوزکریا رازی اور ابن خلدون ایسے مسلمان حکماء نے فکر ونظر اور تجربہ ومشاہدہ کے عظیم الشان ایوان تعمیر کیے اور اسی منہاج کو اپنا کر مغرب نے سائنس میں ترقی کی۔

سیدنا لوط علیہ السلام کی مختصر سرگزشت

مولانا عبدالکریم اثری

صاحب تفسیر عروۃ الوثقی

لوط علیہ السلام سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے برادرزادہ ہیں جس کو ہماری زبان میں بھتیجا کہتے ہیں۔ لوط علیہ السلام کے والد کا نام ہارون تھا۔ لوط علیہ السلام کا بچپن سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ گزرا ہے اور ان کی صحیح معنوں میں نشوونما ابراہیم علیہ السلام ہی کی آغوش تربیت کی رہین منت ہے۔ بالکل اسی طرح کے حالات محمد رسول اللہ ﷺ اور علیؓ کے ہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ لوط علیہ السلام مستقل نبی بنائے گئے تھے اور یہ بھی کہ لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے داماد نہیں تھے اور علی محمد رسول اللہ ﷺ کے داماد تھے اور چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء تھے آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی ہو ہی نہیں سکتا تھا اس لئے علیؓ کو علی علیہ السلام کہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ "علیہ السلام" کا جملہ رسل عظام اور انبیائے کرام کیلئے طے پاگیا ہے اور اس طرح صحابہ کرامؓ کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کے الفاظ پڑھے اور لکھے جاتے ہیں کسی غیر صحابی کیلئے یہ الفاظ مناسب نہیں کہ اس میں صحابی ہونے کا اشتباہ ہے اور صحابہ کرامؓ کے بعد سارے اولیائے امت اور نیک وصلحا کیلئے "رحمہ اللہ علیہ" کے الفاظ کہنا مناسب اور ان کے درجہ عزت ووجاہت ہیں۔

لوط علیہ السلام اور سیدہ سارہ رضی اللہ عنہا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بیوی تھیں ساری ہجرتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رہے تھے اس لئے وہ ملت ابراہیمی کے پہلے مسلم اور "السابقون الاولون" میں شامل ہیں اور بالکل یہی شرف سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو بھی حاصل ہے جو ہمارے نبی کریم ﷺ کی سب سے پہلی شریک حیات تھیں۔

تورات کے بیان کے مطابق مصر کے قیام میں چونکہ ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام دونوں کے پاس کافی ساز وسامان تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ بھی تھے بلاشبہ دونوں چچا بھتیجا آپس میں شیر وشکر تھے لیکن دونوں کی علیحدہ علیحدہ ملکیت ہونے کے باعث ان کے چرواہے اور ملازم وحافظ آپس میں الجھے رہتے تھے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے چرواہے چاہتے تھے کہ اس چراگاہ اور سبزہ

ذرا سے پہلے ہمارے ریوڑ فائدہ اٹھا لیں اور سیدنا لوط علیہ السلام کے چرواہوں کی خواہش ہوتی کہ اول ہمارا حق سمجھا جائے کہ ساتھ دینے والے کو اولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے چرواہوں کی خواہش ہوتی کہ اول ہمارا حق سمجھا جائے کہ ساتھ دینے والے کو اولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت حال کا اندازہ کر کے سیدنا لوط علیہ السلام سے مشورہ کیا اور دونوں کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ باہمی تعلقات کی خوشگواری اور دائمی محبت والفت کی بقاء کیلئے ضروری ہے کہ لوط مصر سے ہجرت کر کے شرق اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ کی طرف چلے جائیں اور وہاں رہ کر دین حنیف کی تبلیغ کریں اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام واپس فلسطین چلے جائیں اور وہاں رہ کر اسلام کی تعلیم و تبلیغ کو سر بلند کریں لہٰذا اس پروگرام کے مطابق عمل ہوا۔ مصر سے لوط علیہ السلام سدوم کو چلے گئے اور ابراہیم علیہ السلام فلسطین کی طرف روانہ ہو گئے۔

اردن کی جانب جہاں آج بحر میت یا بحر لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں۔ اس کے قریب بسنے والوں کا یہ خیال ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اس وقت سمندر ہے کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے اور سدوم و عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے سمندر نہیں تھا بلکہ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کو سخت زلزلے اور بھونچال نے ایسا ہلا دیا کہ یہ زمین تقریباً چار سو میٹر بلند سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا اس لئے اس کا نام بحر میت یا بحر لوط پڑ گیا (بستانی جلد ۹ ص ۵۳۷ بحوالہ قصص القرآن)

صحیح حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے البتہ اس بات کی قوی شہادت موجود ہے کہ اس بحر میت یا بحر لوط کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قوم لوط کے عذاب سے موسوم ہے اور جو موجودہ اثری تحقیق نے بحر میت کے ساحل پر لوط علیہ السلام کی بستیوں کے بعد تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اس علم و یقین کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان چودہ سو سال قبل قرآن نے کر دیا تھا۔

لوط علیہ السلام جب سدوم میں آئے اور یہاں قیام کیا تو دیکھا کہ یہاں کے باشندے بہت سی معصیتوں میں مبتلا ہیں کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں جو ان لوگوں میں پائی نہ جاتی ہو اور کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو ان میں موجود نہ ہو۔ یہ قوم دنیا کی سرکش، بدتر و بد اخلاق اور بد اطوار قوم کے دوسرے سارے عیوب کے ساتھ ایک ایسا خبیث عمل بھی رکھتی تھی جو دوسری کسی قوم میں اس وقت تک دیکھا یا سنا نہیں گیا تھا کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے عورتوں کی بجائے امرد لڑکوں کے شیدائی تھے یہی بدبخت

قوم ہے جس نے اس ناپاک عمل کی طرح ڈالی اور اس کا نام "سدومیت" ہے لیکن افسوس کہ ہم مسلمانوں کے ہاں اس کو لوط علیہ السلام کی نسبت سے "لواطت" کا نام دیا گیا جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ سدومی لوط علیہ السلام کی خاندانی برادری کے افراد تھے۔ علاوہ ازیں سدومیوں میں وہ ساری قباحتیں موجود تھیں جو ایسے افراد میں ہوتی ہیں گویا ہر بدعملی دوسری کے ساتھ جنم لے لیتی ہے۔

چنانچہ عبدالوہاب نجار جو مورخین میں سے اپنے فن کے ماہر مورخ سمجھے جاتے ہیں کہتے ہیں کہ میں نے عبرانی ادب کی ایک کتاب میں ان کی بعض بداعمالیوں کا حال پڑھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل سدوم کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں اور سوداگروں کے مال کو ایک نئے اور اچھوتے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے چنانچہ ان کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی سوداگر باہر سے آ کر سدوم میں مقیم ہوتا تو اس کے مال کو دیکھنے کے بہانے سے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیزیں اٹھاتا اور لے کر چل دیتا اور تاجر بے چارہ حیران و ششدر ہو کر رہ جاتا۔ اب اگر اس نے اپنے ضیاع مال کا شکوہ کیا اور رونے دھونے لگا تو ان لٹیروں میں سے ایک آتا اور لوٹی ہوئی ایک دو چیزیں دکھلا کر کہنے لگتا کہ بھائی میں تو یہ لے گیا تھا او تمہاری یہ چیز موجود ہے وہ رنجیدہ آواز میں کہتا یہ کہ میں اس کو لے کر کیا کروں گا جہاں میرا سارا مال لٹ گیا وہاں یہ بھی سہی جا تو لے جا جب یہ معاملہ ختم ہو جاتا تو اب دوسرا آتا اور وہ بھی اسی طرح کوئی معمولی سی چیز دکھا کر وہی کہتا جو پہلے نے کہا تھا اور سوداگر رنج و غم و غصہ میں اس سے بھی وہی کچھ کہتا۔ اس طرح سب اس کا مال ہضم کر جاتے اور سوداگر کو لوٹ کھسوٹ کر بھگا دیتے۔

اس کتاب میں یہ عجیب قصہ بھی موجود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور سارہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ لوط علیہ السلام کی خیر و عافیت معلوم کرنے کیلئے اپنے خانہ زاد الیعرز دمشقی کو سدوم روانہ کیا۔ وہ جب بستی کے قریب پہنچا تو اجنبی سمجھ کر ایک سدومی نے اس کے سر پر پتھر دے مارا اور الیعرز کے سر سے خون جاری ہو گیا تب آگے بڑھ کر سدومی کہنے لگا کہ میرے پتھر مارنے کی وجہ سے یہ تیرا سر سرخ ہوا ہے لہٰذا مجھے اس کا معاوضہ ادا کر اور اس مطالبہ کیلئے اس بچارے کو کھینچتا ہوا سدوم کی عدالت میں لے گیا حاکم سدوم نے مدعی کا بیان سن کر کہا بالکل ٹھیک الیعرز کو سدومی کے پتھر مارنے کی اجرت دینی چاہئے الیعرز یہ سن کر غصہ میں آ گیا اور ایک پتھر اٹھا کر حاکم کے سر پر دے مارا اور کہنے لگا کہ میرے پتھر مارنے کی جو اجرت ہے وہ تو اس سدومی کو دے دو اور یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔

یہ واقعات صحیح ہوں یا غلط لیکن ان سے یہ روشنی ضرور پڑتی ہے کہ اہل سدوم اس قدر ظلم، فحش،

بے حیائی، بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا تھے کہ اس زمانہ کی قوموں میں ان کی جانب سے اس قسم کے واقعات عام طور پر منسوب کئے جاتے تھے۔

لوط علیہ السلام کتنی مدت ان میں رہ چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے نوازا کچھ معلوم نہیں تاہم یہ بات تو یقینی ہے کہ لوط علیہ السلام ان میں سکونت پذیر ہونے کے باعث فریقین ایک دوسرے سے اچھی طرح مانوس ہو چکے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھ چکے تھے اور اگر کوئی زبان کا اختلاف تھا تو وہ بھی یقینی حل ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو انہی بستیوں کی طرح نبی مبعوث کر دیا اور لوط علیہ السلام نے اللہ کا پیغام ان کو سنانا شروع کر دیا اور ان کی برائیوں سے ان کو روکنے کی پوری کوشش کی۔ لوط علیہ السلام نے ان کی بے حیائیوں اور خباثتوں پر ملامت کی اور شرافت و طہارت کی زندگی کی رغبت دلائی اور حسن خطابت، لطافت اور نرمی کے ساتھ جو ممکن طریقے سمجھانے کے ہو سکتے تھے استعمال کئے اور ان کو سمجھایا اور موعظت و نصیحت کی اور گزشتہ اقوام کی بداعمالیوں کے نتائج و ثمرات بتا کر عبرت دلائی لیکن ان بدبختوں پر مطلق اثر نہ ہوا بلکہ اس کا الٹا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ برملا کہنے لگے کہ: "اس لوط اور اس کے خاندان کو اپنے شہر سے نکال دو۔ یہ بلاشبہ بہت ہی پاک لوگ ہیں" (الاعراف ۷:۸۲) انھم اناس یتطھرون "بلاشبہ یہ پاک لوگ ہیں" قوم لوط کا یہ مزاحیہ فقرہ تھا گویا انہوں نے لوط علیہ السلام اور ان کے خاندان کا استہزا کرتے ہوئے ان کا ٹھٹھا اڑاتے ہوئے یہ الفاظ کہے کہ بڑے پاک باز ہیں ان کا ہماری بستی میں کیا کام یا ناصح مشفق کی مربیانہ نصیحت سے غیظ و غضب میں آ کر کہتے تھے کہ ہم ناپاک اور بے حیاء ہیں اور وہ بڑے پاکباز ہیں تو ان کا ہماری بستی سے کیا واسطہ؟ ان کو یہاں سے نکالو یہ پاکبازوں میں جا کر رہیں اور بسیں۔

قوم کے اس استہزاء اور مذاق کی پرواہ انبیائے کرام علیہ السلام کا شیوہ نہیں وہ ان باتوں سے بالکل بے نیاز تھے کہ کون کیا کہتا ہے؟ ان کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا تھا اور کسی کے روکنے سے پیغام پہنچانے کی ذمہ داری سے رک نہیں جاتے تھے اور یہی کام لوط علیہ السلام نے کیا قوم کے اس طرح کے الٹی میٹم کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی تبلیغ جاری رکھی اور فرمایا کہ لوگو تم کو اتنا بھی احساس نہیں رہا کہ یہ سمجھ سکو کہ مردوں کے ساتھ بے حیائی کا تعلق، لوٹ مار اور اس قسم کی دوسری بداخلاقیاں بہت برے اعمال ہیں، تم یہ سب کچھ کرتے ہو اور پھر محفلوں اور مجلسوں میں کرتے ہو اور پھر شرمندہ ہونے کی بجائے بعد میں ان کا ذکر ایک دوسرے کو اس طرح سناتے ہو کہ گویا یہ کارنمایاں ہیں جو تم نے انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ: "کیا

تمہارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو اور راہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو؟" (العنکبوت ۲۹:۲۹)

یعنی یہ فحش کام چھپ کر بھی نہیں کرتے بلکہ اعلانیہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسروں کے سامنے اس کا ارتکاب کرتے ہو اور یہی بات سورہ نمل میں اس طرح فرمائی گئی کہ "تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے فحش کاری کرتے ہو؟"

لوط علیہ السلام کی یہ باتیں سن کر انہوں نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا: "ائتنا بعذاب اللہ ان کنت من الصدقین" "لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے۔"

جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ چکے ایک وقت لوط علیہ السلام نے ان کو یہ کہا تھا کہ "بھائیو! یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لئے پاکیزہ تر ہیں۔ کچھ اللہ کا خوف کھاؤ اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی موجود نہیں۔" تو انہوں نے برملا جواب سنا دیا کہ: "تجھے معلوم ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم کس چیز کے شیدائی ہیں" (ھود ۱۱:۷۹)

یہ فقرہ ان لوگوں کے نفس کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے کہ وہ خباثت میں کس قدر ڈوب گئے تھے۔ بات صرف اس حد تک ہی نہ رہی تھی کہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندی اور خلاف فطرت راہ پر چل پڑے تھے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اب اس گندی راہ ہی میں تھی۔ ان کے نفس میں اب طلب اس گندگی ہی کی رہ گئی تھی اور وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے کہ یہ راستہ ہمارے لئے بنا ہی نہیں ہے۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے جس سے فروتر کسی مرتبے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس شخص کا معاملہ تو بہت ہلکا ہے جو محض نفسی کمزوری کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن حلال کو چاہنے کے قابل اور حرام کو بچنے کے قابل چیز سمجھتا ہے ایسا شخص کبھی سدھر بھی سکتا ہے اور اگر نہ سدھرے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک بگڑا ہوا انسان ہے مگر جب کسی شخص کی ساری رغبت صرف حرام میں ہی ہو اور پھر وہ یہ بھی سمجھے کہ حلال اس کیلئے ہے ہی نہیں تو اس کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جا سکتا وہ دراصل ایک گندہ کیڑا ہے جو غلاظت ہی میں پرورش پاتا ہے اور طیبات سے اس کے مزاج کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ ایسے گندے کیڑے اگر کسی صفائی پسند گھر میں پیدا ہو جائیں تو وہ اپنی پہلی فرصت میں ان پر فینائل

ڈال کر ان کے وجود سے اپنے گھر کو پاک کر دیتا ہے۔

غرض لوط علیہ السلام کے ابلاغ حق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قوم پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اپنی بداخلاقیوں پر اسی طرح قائم رہی۔ سیدنا لوط علیہ السلام نے یہاں تک غیرت دلائی کہ تم اس بات کو نہیں سوچتے کہ میں آئے دن جو اسلام اور صراط مستقیم کی دعوت و پیغام کیلئے تمہارے ساتھ حیران و سرگرداں ہوں کیا کبھی میں نے تم سے سعی و کوشش کا کوئی ثمرہ طلب کیا ہے؟ کیا کوئی اجرت مانگی ہے؟ کسی نذر و نیاز کا طالب ہوا ہوں؟ میرے پیش نظر تو تمہاری دینی و دنیوی سعادت و فلاح کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے مگر تم ہو کہ مطلق توجہ ہی نہیں کرتے۔ مگر ان کے تاریک دلوں پر یہ سب کچھ کہنے کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ لوط علیہ السلام کو "اخراج" اور "سنگساری" کی دھمکیاں بدستور دیتے ہی رہے جب نوبت یہاں تک پہنچی اور ان کی سیاہ بختی نے کسی طرح اخلاقی زندگی پر آمادہ نہ ہونے دیا تو اس وقت ان کو بھی وہی پیش آیا جو اللہ کے بنائے ہوئے قانون جزاء کا قطعی اور حتمی فیصلہ ہے یعنی بدکرداریوں پر اصرار کی سزا بربادی و ہلاکت سنت اللہ میں طے ہے۔

مختصر یہ کہ وہ ملائکۃ اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے کی خوشخبری دینے کے بعد وہاں سے رخصت ہونے کے بعد سدوم پہنچ گئے اور لوط علیہ السلام کے ہاں مہمان ہوئے یہ اپنی شکل و صورت میں حسین و جمیل اور عمر میں امرد لڑکوں کی شکل و صورت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی لباس انکو یہاں آنے کیلئے دیا گیا تھا جس شکل و صورت کے سدومی شیدائی تھے۔ لوط علیہ السلام نے ان مہمانوں کو دیکھا تو ڈر گئے کہ اب نہ معلوم یہ بدبخت قوم میرے ان مہمانوں کے ساتھ کیا کرے گی؟ کیونکہ ابھی تک ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہیں۔

ابھی لوط علیہ السلام اسی کشمکش و پیچ میں تھے کہ قوم کو خبر لگ گئی اور وہ لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے اور مطالبہ شروع کر دیا کہ تم ان کو ہمارے حوالے کر دو۔ لوط علیہ السلام نے بہت سمجھایا اور کہا کہ کیا تم میں کوئی بھی سلیم الفطرت انسان نہیں ہے کہ وہ انسانیت کو برتے اور حق کو سمجھے؟ تم کیوں اس لعنت میں گرفتار ہو اور خواہشات نفس کے ازالہ کیلئے فطری طریق عمل کو چھوڑ کر اور حلال طریقہ سے عورتوں کو رفیقہ حیات بنانے کی جگہ اس ملعون بے حیائی کے درپے ہو رہے؟ کاش! میں "رکن شدید" کی زیر دست حمایت حاصل کر سکتا۔

لوط علیہ السلام کی اس پریشانی کو دیکھ کر ملائکہ نے کہا کہ آپ ہماری ظاہری صورتوں کو دیکھ

کر گھبرائیے نہیں ہم آپ کو ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کی خبر دینے کیلئے بھیجے گئے ہیں اس لئے کہ اللہ کے قانون "جزائے اعمال" کا فیصلہ ان کے حق میں اٹل ہے۔ وہ اب ان کے سر سے ٹلنے والا نہیں۔ آپ اور آپ کا خاندان اللہ کے اس نہ ٹلنے والے عذاب سے محفوظ رہے گا۔ مگر آپ کی بیوی ان کی رفاقت میں ہلاک ہو جائے گی اور آپ کا ساتھ نہ دے گی۔ پھر آخر عذاب الٰہی کا وہ مقررہ وقت آپہنچا ابتدائے شب ہوئی تو لوط علیہ السلام ان کی دی گئی ہدایت کے مطابق اپنے خاندان سمیت دوسری جانب سے نکل کر سدوم سے رخصت ہو گئے اور انکی بیوی نے انکی رفاقت سے انکار کر دیا اور راستہ ہی سے لوٹ کر سدوم واپس آ گئی۔

آخر شب ہونے کو تھی کہ اول ایک ہیبت ناک چیخ نے اہل سدوم کو تہ و بالا کر دیا اور پھر آندھی اور سنگریزوں کی بارش نے ساری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ایک ہی شدید زلزلے سے زمین سمندر کی اصل تہ سے بھی کہیں نیچے دھنسا دی گئی کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

قبل اس کے کہ ان آیات کریمات کو ایک جگہ جمع کیا جائے جہاں جہاں قرآن کریم میں لوط علیہ السلام کا تذکرہ ہے دو تین باتیں مزید سمجھنے کی ہیں ان کو سمجھ کر پھر آگے چلیں گے۔ ان شاء اللہ۔

۱۔ کہا جاتا ہے کہ لوط علیہ السلام نے "لو ان لی بکم قوۃ او اوی الی رکن شدید" (ہود ۱۱:۸۰) "کاش میرے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ (تمہیں سیدھا کر دیتا) یا "رکن شدید" کی طرف ٹھکانا پکڑتا۔ کے الفاظ بیان فرما کر غیر اللہ کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ حالانکہ اس آیت سے غیر اللہ کی طرف توجہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جس نے کہا اس کی اپنی تفہیم درست نہ ہوئی۔ اس لئے کسی نے اس سے لوط علیہ السلام کا خاندان مراد لیا اور کسی اور نے کوئی چیز مگر جبکہ ایسی کوئی بات بھی نہیں۔

اس رکن شدید سے کیا مراد ہے؟ کیا لوط علیہ السلام نے "نعوذ باللہ" اللہ کی قدرت پر بھروسہ نہ کیا کہ وہ کسی "رکن شدید" کی پناہ کے طالب تھے؟

خود نبی اعظم و آخر ﷺ کی زبان اقدس نے اس کا فیصلہ فرما دیا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

يغفر الله للوط ان كان ليأوى الى ركن شديد (صحیح بخاری مع فتح الباری پارہ ۱۳، ص ۴۲۲) اللہ لوط کو بخشے کہ وہ (کس قدر پریشان کئے گئے) کہ رکن شدید (اللہ تعالیٰ) کی طرف ہجرت کے طالب ہوئے۔ زیر نظر حدیث پر نہایہ ابن الاثیر اور مجمع البحار میں یہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ:

رحمة الله لوطا ان كان ياوى الى ركن شديد الى الله الذى هو اشد الاركان

والقوھا واصنعا ثم رحم علیہ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ لوط علیہ السلام نرم مزاج اور قابل رحم تھے کہ قوم کی شرارتوں سے تنگ آ کر انہوں نے رکن شدید کی طرف توجہ فرمائی جس سے مراد ان کی اللہ پاک کی ذات گرامی ہے کہ وہ مجھے بحفاظت تام کسی بہتر جگہ پہنچا دے اور یہ وہی بات ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام لوط علیہ السلام کے سامنے کئی بار کہہ چکے تھے جیسے انی ذاھب الی ربی (الصافات ۹۹:۳۷) انی مھاجر الی ربی (العنکبوت ۲۶:۲۹) میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں اور یہ کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں امید ہے کہ وہ مجھے بحفاظت تام کسی بہتر جگہ پر پہنچا دے گا اور یہی بات لوط علیہ السلام نے کی ہے اس لئے کہ ابھی تک فرشتوں نے ہجرت کی اطلاع آپ کو نہ دی تھی اور آپ کے اس جملہ کے بعد کچھ زیادہ دیر نہ لگی کہ آپ کو ہجرت کا حکم سنا دیا گیا اور رات آنے تک آپ وہاں سے محفوظ مقام کی طرف ہجرت کر بھی گئے۔

نبی اعظم و آخر ﷺ کے الفاظ یغفر اللہ للوط اور شارحین کے جملہ رحم اللہ لوطا سے کسی صاحب کو وہم نہ ہو کہ جب کوئی غلطی لوط علیہ السلام نے نہیں کی تو پھر ان الفاظ کا مطلب کیا؟

یاد رہے کہ رحم اللہ فلاناً محل مدح میں واقع ہے اور یہ لفظ مختلف جگہوں میں "محل مدح" کے طور پر خود رسول اللہ ﷺ نے بار بار استعمال فرمایا ہے اس سے کسی گناہ کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن علی قال قال رسول اللہ ﷺ رحم اللہ ابابکر زوجنی ابنتہ وحملنی الی دار الھجرۃ واعتق بلالا من مالہ رحم اللہ عمر یقول الحق وان کان مرا ترکہ الحق و مالہ صدیق رحم اللہ عثمان تستحییہ الملائکۃ رحم اللہ علیا اللھم ادر الحق معہ حیث دار (جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۱۹ باب مناقب علی) رحم اللہ امرا صلی قبل العصر اربعا (ابوداؤد ج اول ص ۱۸۰)

رحم اللہ رجلا قام من اللیل فصلی وایقظ امرأتہ فان ابت نضح فی وجھھا الماء رحم اللہ امرأۃ قامت من اللیل (ابوداؤد ج اول ص ۱۸۵)

یہ سب مناقب و فضائل میں کہا گیا ہے، مثالب و رذائل کا نہ کوئی شبہ ہے اور نہ گنجائش۔

پھر رکن شدید کے متعلق صاف بیان محدثین و مفسرین کا موجود ہے جیسا کہ اوپر بھی بیان کیا گیا ہے اور مزید یہ ہے کہ فالمراد بالرکن الشدید ھو اللہ سبحانہ و تعالٰی فانہ اشد الارکان اقواھا وامنعھا (عون الباری ص ۲۸۹ ج ۴، عمدۃ القاری ص ۲۲ ج ۱۵، فتح الباری شرح صحیح بخاری پارہ ۱۳ ص ۳۳۳، سراج وہاج ص ۳۳۲ ج ۲ صحیح مسلم مع شرح نووی ج اول ص ۸۶)

الرکن الشدید من اللہ الذی لا رکن مثلہ (مشکل الآثار امام طحاوی ج اول ص ۱۳۵)

مطلب صاف ہو گیا کہ سیدنا لوط علیہ السلام اللہ کو بھول کر کسی اور قوت کی پناہ کے طالب نہ تھے بلکہ وہ اس درجہ قابل رحم حالت میں تھے کہ اس وقت ان کی یہ تمنا ہوئی کاش اگر اللہ تعالٰی مجھے ایسی قوت عطا فرماتا کہ میں اس وقت ان سب بدبختوں کو اس کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا اور "رکن شدید" یعنی اس کے پروردگار نے آخر ان کی مدد کی اور ان پر فرشتوں نے سارا راز ظاہر کر دیا اور ان کو تسلی اور اطمینان دیا کہ آپ پریشان نہ ہوں تھوڑا ہی وقت گزرے گا کہ یہ اپنی اس بدکرداری کے عبرت ناک انجام کو پہنچ جائیں گے۔

اس راز کے کھل جانے کے بعد سدوم سے ہجرت کر کے مع اپنے خاندان کے افراد کے ضوع یا صغر کی بستی میں چلے گئے جو سدوم سے قریب ہی آباد تھی اور بعد ازیں جلد ہی صغر کو بھی چھوڑ کر قریب ہی ایک پہاڑی پر جا کر آباد ہو گئے اور امن و امان سے رہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

۴۔ لوط علیہ السلام کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مہمانوں کی حفاظت کیلئے اپنی بیٹیاں کیسے پیش کر دیں؟ کیونکہ آپ نے ان سے فرمایا ہے کہ "ھولاء بنتی ھن اطھر لکم (ھود ۷۸:۱۱) ھولاء بنتی ان کنتم فعلین (الحجر ۷۱:۱۵) یعنی لوط علیہ السلام نے قوم کی مزاحمت اور مہمانوں سے متعلق مطالبہ سے تنگ آ کر یہ فرمایا کہ "تم ان مہمانوں سے تعرض نہ کرو اگر نفس کی فطری خواہش پوری کرنا چاہتے ہو تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لئے پاک ہیں" اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک باعصمت و باعزت انسان اور پھر وہ نبی معصوم کس طرح یہ گوارا کر سکتا تھا کہ اپنی باعصمت لڑکیوں کو ایسے بے حیا اور خبیث انسانوں کے سامنے پیش کرے؟

بلاشبہ اس طرح فرضی سوال اٹھائے گئے اور پھر مختلف طریقوں سے ان کے جواب بھی دیے گئے حالانکہ ذرا غور کر لیا جاتا تو اس طرح کے سارے سوال خود بخود ہی ختم ہو کر رہ جاتے بڑی تمہیدات کی کوئی ضرورت نہ پڑتی۔ بات بالکل صاف ہے کہ لوط علیہ السلام نبی و رسول ہیں اور ہر ایک نبی و رسول اپنی پوری امت کا روحانی باپ ہے قوم مسلمان ہو کر اس کی اطاعت گزار ہو یا انکار کر کے متمرد و منحرف ہو جائے دونوں صورتوں میں وہ اس کی امت میں داخل ہے اگرچہ پہلا گروہ "امت اجابت" کہلاتا ہے اور دوسرا گروہ "امت دعوت" اور اس طرح تمام امت اس کی اولاد ہوتی ہے اور نبی و رسول اس پوری امت کا روحانی باپ۔

ظاہر ہے کہ اس طرح لوط علیہ السلام نے جو "بنتی" کا لفظ ارشاد فرمایا تو اس کے ساتھ "من اطھر لکم" بھی فرمایا یعنی میری بیٹیاں جو تمہارے ساتھ بیاہی جاچکی ہیں وہ تمہاری اس نفسانی خواہش کے ازالہ ہی کیلئے تو ہیں جو تمہارے لئے حلال اور پاکیزہ ہیں پھر تم کتنے بدبخت ہو کہ ان کو چھوڑ کر اس ملعون اور خبیث کام پر اصرار کرتے ہو ایسا نہ کرو "العیاذ باللہ" یہ مقصد بالکل نہ تھا کہ وہ اپنی صلبی لڑکیاں ان کو پیش فرما رہے تھے۔ جس نے یہ سمجھا یا جس نے یہ کہا بالکل غلط سمجھا اور بالکل غلط کہا۔

ہمیں تعجب ہے کہ علامہ عبدالوہاب نجار مصری نے اس پر یہ سوال کیسے اٹھا دیا کہ "یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ لوط علیہ السلام ان کافر عورتوں کے باپ تسلیم کئے جائیں؟ اس میں باپ تسلیم ہونے یا بیٹیاں تسلیم کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے ہر زبان میں کسی بچی یا کسی بچے کو بیٹی یا بیٹا" "ایھا الولد" "My son" کے لفظ سے یاد کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح کسی بزرگ اور بڑے آدمی کو "ابو" "چچا" اور "والدی" "Father" کہا جا سکتا ہے اور اس سے وہ حقیقی اور صلبی اولاد یا باپ نہیں بن جاتا۔ اتنی عام فہم بات کو کیا سے کیا بنا دیا گیا۔

اور سب سے بڑھ کر ثبوت اس معاملہ میں اللہ کی کتاب ہے اور اس نے خود اس بات کا دوسری جگہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ لوط علیہ السلام نے ان لوگوں کو ان کی اپنی بیویوں کی طرف توجہ دلائی تھی وہ بات نہیں کی تھی جس پر سوال جواب کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

اتاتون الذکران من العلمین ۔ وتذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم بل انتم قوم عدون ۔ (الشعراء ۲۶: ۱۶۶،۱۶۵) "کیا تم دنیا جہان میں مردوں ہی کے پاس آتے ہو اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لئے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ (کتنے نالائق ہو تم) بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو" اب انہی "ازواجکم" کو لوط علیہ السلام نے "بنتی ھن اطھر لکم" کہہ دیا ہے تو آخر کونسی قیامت ہو گئی ہے؟ اور کیوں اس بحث کو اتنا طول دیا گیا ہے؟ چنانچہ درمنثور ج ۳ ص ۳۴۴ میں بحوالہ ابوالشیخ عبداللہ بن عباسؓ مروی ہے کہ:

"ما عرض لوط علیہ السلام بناتہ علی قومہ لا سفاحا ولا نکاحا انما قال ھؤلاء بناتی نساءکم لان النبی اذا کان بین ظھری قوم فھو ابوھم قال اللہ فی القرآن وازواجہ امھاتھم وھو ابوھم فی قراۃ ابی"

نیز بحوالہ ابن عساکر اور ابن ابی الدنیا سدی سے مروی ہے کہ:

"ھؤلاء بناتی قال عرض علیھم نساء امتہ کل نبی ابو امتہ وفی قراۃ عبداللہ النبی اولی

بالمؤمنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم"

نیز بحوالہ ابن جریر ابن ابی حاتم وغیرہ مجاہد اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ:

"لم تکن بناتہ ولکن کن من امتہ وکل نبی ابو امتہ ... انما دعاھم الی نساءھم وکل نبی ابو امتہ"

۳۔ کیا لوط علیہ السلام کی بیوی کافرہ اور مشرکہ تھی یا زانیہ اور بدکار؟ یہ سوال پیچھے نوح علیہ السلام کے تذکرہ میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ سمجھ لینا چاہئے کہ کسی نبی کے حسب و نسب میں زنا جیسی بدکاری کا صدور تسلیم نہیں اور نہ ہی کسی نبی کے اہل یعنی زوجہ میں۔ ہاں حسب و نسب میں کفر شرک اور اہل زوجہ میں مرض منافقت کا صدور ممکن ہے۔ جس کو نبی کی خیانت پر محمول کیا گیا ہے اور یاد رہے کہ نوح علیہ السلام کی بیوی "واہلہ" اور لوط علیہ السلام کی بیوی "واعلہ" دونوں میں نبوی خیانت موجود تھی زوج کی خیانت نہیں اور اللہ کے ان دونوں بندوں کا کمال ہے کہ انہوں نے باوجود نبی و رسول ہونے کے نبوت و رسالت کی خیانت کو برداشت کرتے ہوئے وقت گزار دیا اور اپنی زوجیت سے ان کو فارغ نہیں کیا جس میں ساری امتوں کیلئے جو ان کے بعد آئیں ایک "اسوہ حسنہ" موجود ہے اور قرآن کریم نے اس کو بیان فرما کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ میاں بیوی کا تعلق کتنا ہی قریب کا تعلق ہے لیکن اتنا قریب بھی اس شخص کیلئے مفید مطلب ثابت نہیں ہوتا جس شخص میں نبی و رسول کی نافرمانی کے جراثیم موجود ہوں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

ضرب اللہ مثلا للذین کفروا امرات نوح و امرات لوط ط کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخانتھما فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئا و قیل ادخلا النار مع الدخلین۔ (التحریم ۶۶: ۱۰)

"اللہ کافروں کے معاملہ میں نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کو بطور مثال پیش کرتا ہے وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں مگر انہوں نے دونوں نبیوں سے (باوجود ان کی بیویاں ہونے کے) خیانت کی اور وہ (نبی) اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے اور ان دونوں (نبیوں کی بیویوں سے) کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی داخل ہو جاؤ۔" اس معاملہ میں مشاہیر علمائے اسلام و مفسرین کرام نے تشریح و تفسیر کر دی ہے۔

چنانچہ تفسیر البیان میں زیر نظر آیت کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ:

وقد وقعت الادلۃ الاجماعیۃ علی انھا ما زنت امراۃ نبی قط

"سب مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی نبی کی بیوی زانیہ نہیں ہوئی"

درمنثور ج ۳ ص ۳۳۵ میں بحوالہ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے:

ان نساء الانبیاء لا یزنین ۔ ''نبیوں کی بیویاں کبھی زنا کار نہیں ہو سکتیں''

در منثور ج ۶ ص ۲۳۵ میں بحوالہ عبدالرزاق فریابی ابن منذر ابن ابی حاتم ابن عساکر اور ابو الشیخ عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ:

ما بغت امراة نبی قط ''کسی نبی کی بیوی زنا کار نہیں ہوئی اور نہ ہی ہو سکتی تھی''

در منثور ج ۶ ص ۲۳۵ بحوالہ ابن عساکر اشرس خراسانی سے مرفوعاً آیا ہے کہ:

انه قال ما بغت امراة نبی قط ''نبی اعظم و آخر ﷺ نے فرمایا کہ کبھی بھی کسی نبی کی بیوی بدکار (زانیہ) نہیں ہوئی۔''

در منثور ج ۶ ص ۲۳۵ بحوالہ عبدالرزاق فریابی، سعید بن منصور، عبد بن حمید، ابن ابی الدنیا، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، حاکم عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ:

ما زنتا اما خیانة امرأة نوح فکانت تقول للناس انه مجنون واما خیانة امرأة لوط فکانت تدل علی الضیف فتلک خیانتها .... ''وہ بدکار نہیں تھیں، نوح علیہ السلام کی بیوی تو لوگوں سے کہہ دیتی کہ وہ نوح علیہ السلام مجنون ہے اور لوط علیہ السلام کی بیوی دوسرے لوگوں کو باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کی اطلاع کر دیتی تھی''

تفسیر مواہب الرحمن میں ہے کہ ''کسی نبی کی بیوی کبھی بدکار نہیں رہی، ان دونوں عورتوں کی خیانت دراصل دین کے معاملہ میں تھی نوح علیہ السلام بیوی اپنی قوم کے جباروں کو ایمان لانے والوں کی خبریں پہنچایا کرتی تھی اور لوط علیہ السلام کی بیوی اپنے شوہر کے ہاں آنے والے لوگوں کی اطلاع اپنی قوم کے بداعمال لوگوں کو دے دیا کرتی تھی'' (زیر نظر آیت زیر بحث)

در منثور ج ۶ ص ۲۳۴ میں بحوالہ ابن عدی، ابن عساکر، شعب الایمان ضحاکؒ سے مروی ہے:

انما کانت خیانة امرأة نوح وامرأة لوط النمیمة ''ان دونوں عورتوں کو چغل خوری کی عادت تھی ادھر کی باتیں ادھر کرتی رہتی تھیں''

مفردات امام راغب میں خیانت کا ترجمہ ''نفاق'' کیا ہے اور یہ ان ساری باتوں پر ''حاوی'' ہے جو پیچھے ذکر کی جا چکی ہیں لیکن کسی منافق کو بھی محض اس کے نفاق کے باعث زانی نہیں کہا جا سکتا۔ اور ازدواجی زندگی میں آنے کے بعد زوجین میں سے کسی کا نفاق کھل جائے چونکہ وہ نفاق ازدواج بننے سے پہلے معلوم نہ تھا اب اصلاح کی کوشش تو کی جا سکتی ہے لیکن محض اس کے باعث ازدواجی زندگی

منقطع نہیں کرنی چاہئے۔ ازدواجی زندگی کے انقطاع کی جائز وجہیں اور ہیں۔

ازیں بعد ان آیات کریمات کو یکجا جمع کیا جا رہا ہے جن میں سیدنا لوط علیہ السلام کا ذکر ہے۔ حسب معمول ہم ترجمہ پر اکتفا کریں گے۔ متن قرآن سے دیکھ لیں تفسیر دیکھنا مطلوب ہو تو آیتوں کے حوالہ جات سے وہ مقامات نکال کر دیکھی جا سکتی ہے۔

''اور لوطؑ کا واقعہ یاد کر جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کیا تم اس بے حیائی کا کام پسند کرتے ہو جو تم سے دنیا میں کسی انسان نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات سے مردوں پر مائل ہوتے ہو یقیناً تم ایک ایسی قوم ہو گئے ہو جو اپنی نفس پرستیوں میں بالکل چھوٹ ہے؟ لوطؑ کی قوم نے اس کو جو جواب دیا وہ صرف یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے اس آدمی کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو یہ ایسے لوگ ہیں جو بڑے پاک وصاف بن بیٹھے ہیں۔

پھر ایسا ہوا کہ لوط اور اس کے سارے گھر والوں کو ہم نے بچا لیا مگر اس کی بیوی نہ بچی کہ وہ بھی پیچھے رہ جانیوالوں میں تھی۔ ہم نے ان پر ایک انوکھی بارش برسائی جو بھی برسائی سو دیکھو مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟''

(الاعراف ۷: ۸۰ تا ۸۴)

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادہ لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ ان کے آنے سے خوش نہیں ہوا، ان کی موجودگی نے اسے پریشان کر دیا وہ (دل ہی دل میں) بولا آج کا دن بڑی مصیبت کا دن ہے اور اس کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے آئے وہ پہلے ہی برے کاموں کے عادی ہو چکے تھے۔ لوط علیہ السلام نے ان سے کہا کہ لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں (یعنی ان ہی کی عورتیں جو اس بستی میں ان ہی لوگوں کے گھروں میں رہ رہی تھیں اور جنہیں انہوں نے چھوڑ رکھا تھا) یہ تمہارے لئے جائز اور پاک ہیں (کیونکہ تمہارے نکاح میں ہیں) پس (ان کی طرف ملتفت ہو) اللہ سے ڈرو میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں ہے؟

ان لوگوں نے جواب دیا کہ تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے (جن کو تو نے اپنی بیٹیاں کہہ کر ہم کو متوجہ کیا ہے) ہمیں کوئی سروکار نہیں (ہماری رغبت اس طرف نہیں) اور تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کس بات کے شیدائی ہیں۔ لوط نے (ان کی بات سن کر) کہا کاش تمہارے مقابلے کی مجھے طاقت ہوتی (کہ تمہیں سیدھا کر دیتا) یا ''رکن شدید'' کی طرف ٹھکانا پکڑتا (ہجرت کا حکم ملتا تو یہاں سے ہجرت کر جاتا) اس وقت مہمان خود بول پڑے کہ اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں

(گھبرایئے نہیں) یہ لوگ تجھ پر قابو نہیں پاسکیں گے۔ بس تو اس طرح کر کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جائے تو اپنے گھر کے آدمیوں کے ساتھ لے کر یہاں سے ہجرت کر جا اور تم میں سے کوئی ادھر ادھر نہ دیکھے (لیت ولعل نہ کرے) مگر ہاں! تیری بیوی تیرا ساتھ دینے والی نہیں (پیچھے رہ جائے گی) اور جو کچھ ان لوگوں پر گزرنے والا ہے اس پر بھی گزر جائے گا۔ ان لوگوں کیلئے عذاب کا مقررہ وقت صبح کا ہے اور صبح کے آنے میں آخر کتنی دیر ہے؟ (کچھ دیر نہیں)

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا تو ہم اس بستی کی تمام بلندیاں پستی میں بدل کر رکھ دیں گے اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے جو تیرے پروردگار کی طرف سے نشان کئے ہوئے تھے اور (پیغمبر اسلام) یہ بستی (جس کو تہس نہس کرنے کا ذکر کیا جا رہا ہے) آپ کے وقت کے ظالموں سے کوئی دور نہیں ہے۔ (یہ اپنی سیر وسیاحت میں وہاں سے گزرتے رہتے ہیں۔)" (سورہ ہود ۱۱:۷۷ تا ۸۳)

پھر جب ایسا ہوا کہ یہ بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط علیہ السلام کے لوگوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کہ تم لوگ اجنبی آدمی معلوم ہوتے ہو، انہوں نے کہا نہیں ایسی بات نہیں بلکہ ہم تمہارے پاس وہ بات لے کر آئے ہیں جس میں (آپ کی قوم کے) لوگ شک کیا کرتے تھے (یعنی ان کی ہلاکت کی خبر) ہمارا آنا تو ایک امر حق کیلئے ہے اور ہم اپنے بیان میں سچے ہیں۔ بس چاہئے کہ کچھ رات رہے اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر نکل جاؤ (یہاں سے ہجرت کر جاؤ) اور تم خود ان کے پیچھے پیچھے چلو اور اس بات کا خیال رکھو کہ تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے۔ جہاں جانے کا حکم دے دیا گیا ہے (اس طرف رخ کیئے) چلے جاؤ۔

غرض کہ ہم نے لوط علیہ السلام پر حقیقت حال واضح کر دی کہ ہلاکت کا ظہور ہونے والا ہے اور باشندگان شہر سدوم کی بیخ وبنیاد صبح ہوتے ہوتے اکھڑ جانے والی ہے اور اس (اثنا میں ایسا ہوا کہ) شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آپہنچے۔ لوط نے کہا دیکھو یہ آدمی میرے مہمان ہیں تم میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو تم میری رسوائی کے کیوں درپے ہو گئے ہو؟

انہوں نے کہا کیا ہم نے تجھے اس بات سے نہیں روک دیا تھا کہ کسی قوم کا آدمی ہو لیکن اپنے یہاں نہ ٹھہراؤ (اگر ٹھہراؤ گے تو پھر جو کچھ ہمارے جی آئے گا وہ کر گزریں گے) لوط علیہ السلام نے کہا اگر ایسا ہی ہے تو دیکھو یہ میری بیٹیاں یعنی تمہاری بیویاں ہیں جن کی طرف ملتفت ہونے کا تم کو حکم ہے ان کی طرف ملتفت ہو۔

(اس وقت فرشتوں نے لوط سے کہا) تمہاری زندگی (کے رب) کی قسم یہ لوگ تو اپنی بدمستیوں میں کھوئے گئے ہیں (تمہاری باتیں ماننے والے نہیں) غرض (فرشتوں نے جب صورت حال بتادی تو) سورج نکلتے ہی نکلتے ایک ہولناک آواز (الصیحۃ) نے انہیں آلیا۔ پس ہم نے وہ بستی زیر وزبر کر ڈالی اور پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی ان پر بارش کی (کہ آتش فشاں نے پھٹ کر ان کو تہ وبالا کر دیا) بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کیلئے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو (حقیقت کی) پہچان رکھنے والے ہیں (اور جو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیں ان کیلئے کچھ فائدہ نہیں۔)

اور (قوم لوط کی) یہ بستی (کسی غیر معروف گوشے میں نہ تھی وہ) ایسی راہ پر واقع ہے جہاں آمد ورفت کا (اب بھی) سلسلہ قائم ہے اس بستی کی حالت میں ایمان رکھنے والوں کیلئے ایک بڑی ہی نشانی ہے۔" (سورہ الحجر ۱۵:۶۱ تا ۷۹)

"لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب ان کے بھائی لوط علیہ السلام نے ان سے کہا تھا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے کیا تم دنیا جہان کی مخلوق سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لئے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو۔

انہوں نے کہا اے لوط! اگر تو ان باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں ان میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا۔ اس نے کہا کہ تمہارے کرتوتوں پر جو لوگ کڑھ رہے ہیں میں (پہلے ہی) ان میں شامل ہوں، اے پروردگار مجھے اور میرے اہل وعیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے۔ انجام کار ہم نے اسے اور اس کے سارے اہل وعیال کو بچا لیا بجز اس بڑھیا کے جو اس کی بیوی تھی وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر ایک ایسی بارش برسائی جو بہت ہی بری بارش تھی جو ان ڈرائے جانے والوں پر برسائی گئی۔" (الشعراء ۲۶:۱۶۰ تا ۱۷۳)

اور ہم نے لوط کو بھیجا کہ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم تو وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ کیا تمہارا حال یہ ہے کہ تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو؟ پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انہوں نے کہا لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے۔ لوط علیہ السلام نے کہا اے میرے رب! ان مفسد